© rasailojaraid.com

مسئلہ فلسطین اور علامہ اقبال

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

صدر شعبہ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی، کراچی

آج فلسطین شرق اوسط ہی کا نہیں بلکہ عالمی سیاسیات کا پیچیدہ ترین مسئلہ ہے اور بین الاقوامی امن کے لیے سوالیہ نشان بھی، اس بحران کا آغاز اس وقت ہوا جب خالص عرب علاقوں (یعنی فلسطین) میں ایک یہودی ریاست قائم کرنے کے صہیونی منصوبہ پر عمل درآمد شروع کیا گیا۔ اسرائیل مشرق وسطی کی ایک متنازعہ یہودی ریاست ہے جس کا قیام مئی ۱۹۴۸ء میں ایک طویل نظریاتی، سفارتی اور سیاسی کوششوں کے بعد عمل میں آیا، اس وقت علامہ اقبال کے انتقال کو دس سال کا عرصہ گذر چکا تھا لیکن چونکہ اس ریاست کے قیام کی کوششیں انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہو چکی تھیں، لہذا علامہ اقبال اس سے نہ صرف باخبر تھے، بلکہ انہوں نے اپنی شاعری اور تقاریر کے ذریعہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا، اور مسلمانوں کو مقدور بھر صائب مشوروں سے نوازتے رہے۔

اسرائیل کا قیام بیسویں صدی میں ریاستی دہشت گردی کی سب سے بدترین مثال ہے۔ مغربی مورخین اور انٹرنیٹ پر موجود بعض ویب سائٹس کو دیکھنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ خالص سیاسی مسئلہ ہے (۱)۔ جس کا کوئی سیاسی حل بھی تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن یہ محض نصف سچائی ہے، مکمل سچائی یہ ہے کہ اسرائیل کے قیام کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظریاتی، دوسرا سیاسی پہلو۔

علامہ اقبال پر مؤرخین اور محققین نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ اب ان کے ذہنی اور فکری ارتقا کے بارے میں بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ذہنی بلوغت اور فکری ارتقا کے حوالے سے ان کی زندگی کے آخری دس پندرہ سال زیادہ اہم ہیں جبکہ وہ یورپ کو قریب سے دیکھ چکے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندوستان میں سیاسی تبدیلیوں کا تجربہ حاصل کر چکے اور ہندوستان سے باہر بیشتر عالمی مسائل خواہ اس کا تعلق افغانستان سے ہو، مسئلہ کشمیر سے یا مسئلہ فلسطین سے، کا بغور جائزہ لے چکے۔ اور بیشتر ممالک کے سفر بھی کر چکے۔

بیسویں صدی کا آغاز انقلابی تبدیلیوں کا آغاز تھا، عالمی طاقتوں (فرانس اور برطانیہ) کی استعماریت، دنیا کو تیزی سے ایک ہولناک عالمی جنگ کی طرف ہانک رہی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب خود علامہ اقبال حصول علم کی غرض سے جرمنی اور برطانیہ میں مقیم تھے۔ اس وقت خصوصاً برطانیہ میں ایک صیہونی ریاست (یعنی اسرائیل) کے قیام کے سلسلہ میں ابتدائی کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ علامہ اقبال کی قیام یورپ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کی شاعری یا خطوط پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کو اس صیہونی منصوبے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ باوجود اس کے کہ یہ صیہونی منصوبہ بہت ڈھکا چھپا نہیں تھا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب علامہ اقبال یورپ پہنچے تو بتیس تینتیس سالہ جوان تھے [۲] دریافت یورپ کا پہلا تجربہ تھا۔ قیام یورپ کے دوران ان کا بیشتر وقت مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں گزرا اور وہ مغرب کی سیاسی وسفارتی تہوں میں پلنے والی صیہونی تحریک سے بے خبر رہے۔ کیونکہ اس حوالے سے ان کا اس دور کا کلام خاموش ہے۔ جب وہ یورپ سے واپس ہندوستان پہنچے تو عالمی مناظر نامے پر ہونے والی تبدیلیوں کو ہم ان کی شاعری میں محسوس کر سکتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۱۲ء میں جنگ طرابلس [۳] ہوئی تو انہوں نے فاطمہ بنت عبداللہ پر نظم لکھی۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے محاصرہ ادرنہ پر نظم لکھی۔ ترکوں کے ساتھ عربوں کی غداری پر، جس کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانیہ شکست سے دوچار ہوئی، انہوں نے ''دنیائے اسلام'' میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کی سازشوں سے خوب واقف تھے۔ کہتے ہیں

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی　　ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز [۴]

اور اس کا علاج امت مسلمہ کو ''اتحاد ملت'' میں بتاتے ہیں۔

ربط وضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات　　ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی بات کو یوں بھی کہتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

اسرائیل کے حوالے سے سیاسی پیش رفت سے تو علامہ اقبال واقف تھے، اور اپنی وفات تک اس خطرے سے مسلم امہ اور نوجوانوں کو باخبر کرتے رہے، کیا وہ قیام اسرائیل کے نظریاتی پہلو سے بھی کما حقہ واقف تھے؟ اور اگر واقف تھے تو کیا اس کا کوئی مناسب حل تجویز کر سکے؟ ان سوالات کا جواب اس مقالہ کی حد تک تلاش کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

تاہم جب وہ اپنی نظم ''طلوع اسلام'' میں مصطفیٰ کمال اتاترک کی مدح سرای کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

ربود آن ترک شیرازی، دل تبریز وکابل را صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہمسفر پیدا

تو معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اس وقت تک صیہونی ہتھکنڈوں سے کما حقہ آگاہ نہیں تھے۔ کیونکہ بالآخر اسی ''شیرازی محبوب'' (یعنی مصطفیٰ کمال) نے آگے چل کر ۱۹۲۴ء میں خلافت کا خاتمہ کیا اب یہ ڈھکی چھپی نہیں کہ یہ حادثہ عظیم، صیہونی اشاروں پر کیا گیا۔ (۵) جس کے بعد سے آج تک ملت اسلامیہ شدید افتراق کا شکار ہے۔ نیز جس طرح مصطفیٰ کمال نے لادینیت (Secularism) اور معاشرے میں اباحیت کو فروغ دیا، اس نے انہی اقبال کو آٹھ دس سال بعد یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ

''...... میں آپ سے پرزور استدعا کرتا ہوں کہ آپ ہرگز ترکی عورتوں کو تقلید کے لیے اپنا نمونہ نہ بنائیں، نہ مصطفیٰ کمال کی نام نہاد اصلاحات پر جائیں۔ ملک کو فوجی قوت و تنظیم کے بل پر بچانا اور بات ہے، مگر آئندہ زندگی کے لیے قانون وضع کرنا بالکل علیحدہ بات ہے، پہلی بات کے لیے محض قوت کی ضرورت ہے، دوسری کے لیے خاص قابلیتوں کی ضرورت ہے، مصطفیٰ کمال پاشا نے جو کچھ اصلاحات کے سلسلے میں کیا ہے وہ ہرگز حکمت پر مبنی نہیں۔'' (۶)

گویا آٹھ نو سالہ مشاہدہ اور مطالعہ نے بالآخر علامہ اقبال کو اسی نتیجے پر پہنچایا جس سے مصطفیٰ کے بعض ساتھی اس کے خاتمہ خلافت کے خیال کے وقت سے ہی آگاہ ہو گئے تھے۔ یاد رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ مصطفیٰ کمال کے کئی ساتھی مثلاً جنرل کاظم قرہ بکر، رفعت، علی فواد پاشا، خالدہ ادیب خانم، ڈاکٹر عدنان ادیوار، عاکف ارصوی اور حسین رؤف وغیرہ جو ترکوں کی جدوجہد آزادی میں مصطفیٰ کمال کے شانہ بشانہ تھے، اس کی لادینی حکمت عملی اور خلافت کے خاتمہ کی اس تجویز کے سخت مخالف تھے، اس مخالفت کی انہیں بھیانک سزا بھگتنی پڑی۔ انہیں مصطفیٰ کمال نے اپنی آمریت کے بل بوتے پر انتقامی کاروائیوں کا نشانہ بنایا جس کی وجہ سے ان حضرات کو جان بچا کر ترکی سے بھاگنا پڑا۔ اس کے علاوہ اٹھارہ مخالفین کو، حکومت کی جانب سے قائم کردہ نام نہاد ''خود مختار عدالتوں'' نے موت کی سزا سنادی۔ (۷)

علامہ اقبال کو صیہونی سازشوں کا ادراک ان کے سفر فلسطین کے موقع پر ہوا، جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد وہ لندن سے فلسطین گئے اور وہاں یروشلم کی موتمر عالم اسلامی میں ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے کے طور پر شریک ہوئے، اس موقع پر انہیں اس ارض مقدس میں قیام کرنے اور وہاں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش، مصر، یمن، شام، عراق، تیونس اور انڈونیشیا وغیرہ کے نمائندوں سے تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ یہیں دسمبر ۱۹۳۱ء میں موتمر کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے اس ''اعلان بالفور'' (۸) کو مسترد کیا جو بعد میں قیام اسرائیل کی بنیاد بنا، درآں حالیکہ اس پر چودہ سال گزر چکے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''انگریزوں کو بحیرہ مردار کے مالی ذخائر اور دوسرے معاملات کا خیال ترک کر کے اخلاقی حیثیت سے اہل فلسطین کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بالفور کا اعلان منسوخ کر دیا جائے۔'' (۹)

یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

...... مجھے معلوم ہوا کہ موتمر (عالم اسلامی) میں مندوبین اس (صیہونی) سکیم کی شدید مخالفت کر رہے تھے، مجھے یقین ہے فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی سکیم بالاخر ناکام رہے گی، کیونکہ یہودی ہرگز عمدہ کسان نہیں بن سکتا''۔ (۱۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ کا یہ خیال وقت نے غلط ثابت کر دیا، انہیں اس قسم کا خیال غالباً اس لیے بھی تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہود بہت بڑی سود خور قوم ہے، جو فلسطین جیسے غریب اور زرعی علاقہ میں آباد ہونا پسند نہیں کرے گی جہاں ان کے سودی کاروبار کے پنپنے کے آثار بہت کم ہیں۔

اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ فلسطین غریب ملک تھا یا زرعی، بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ فلسطین اس ''ارض موعود'' (Promised Land) کا جزو لاینفک تھا، جس کا تذکرہ تواتر سے یہودیوں کی مذہبی کتاب توارۃ (عہد نامہ عتیق Old Testament) میں کیا گیا ہے اور جس پر یہودی اعتقاد رکھتے ہیں، اور جس کے بارے میں بیشتر مسلمان کو علم نہیں تھا۔

پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ توارۃ میں ''ارض موعود'' کا کیا تصور پیش کیا گیا ہے۔ کتاب پیدائش کے بارہویں باب میں آتا ہے:

''اور خداوند نے ابراہیم (۱۱) سے کہا کہ تو اپنے وطن اور ناتے داروں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا سو تو باعث برکت ہوا، جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے بڑے وسیلے سے برکت پائیں گئے اور ابراہیم اس ملک سے گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔ اس وقت ملک میں کنعانی (۱۲) رہتے تھے۔

خداوند نے ابراہیم کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا۔ (بائبل، کتاب پیدائش، باب ۱۲، آیات ۶۔۷)

''خداوند نے ابراہیم سے کہا جبکہ لوط اس سے جدا ہو چکا تھا کہ اپنی آنکھ اٹھا اور جس جگہ تو ہے وہاں سے شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب کی طرف نظر دوڑا، کیونکہ یہ تمام ملک جو تو دیکھ رہا ہے میں تجھ کو اور تیری نسل کو ہمیشہ کے لیے دوں گا، اور میں تیری نسل کو خاک کے ذروں کی مانند بناؤں گا۔'' (بائبل، کتاب پیدائش، باب ۱۳، آیات) اور سترھویں باب میں آتا ہے:

''اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان سب کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پشتوں کے لیے اپنا عہد جو ابدی عہد ہوگا، باندھوں گا تا کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں۔ اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے۔‘‘(بائبل، کتاب پیدائش، باب ۱۷، آیات ۷۔۸)

توراۃ میں ’’ارض موعود‘‘(Promised Land) کا حدود اربعہ بھی مذکور ہے۔ کتاب پیدائش کے پندرہویں باب میں ہے:

’’اسی روز خداوند نے ابراہیم سے عہد کیا اور فرمایا کہ یہ ملک دریائے مصر سے لے کر عظیم دریائے فرات تک میں نے تیری اولاد کو دیا ہے۔‘‘(بائبل، کتاب پیدائش، باب ۱۵، آیت ۱۸)

یہی بات خصوصیت کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے کہی جو تمام بنی اسرائیل کے جد ہیں۔ ’’اور یہ ملک جو میں نے ابراہیم اور اسحاق کو دیا ہے، سو تجھ کو دوں گا اور تیرے بعد تیری نسل کو بھی یہی ملک دوں گا۔‘‘

توراۃ محرفہ کی مذکورہ بالا آیات اور اس جیسی دیگر آیات ہی وہ بنیادیں فراہم کرتی ہیں، جن کے سہارے یہودیوں ہی نہیں بلکہ عیسائیوں کی طرف سے بھی فلسطین میں ایک ملک کا دعویٰ کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف مسلمان (خواہ عرب ہوں یا غیر عرب) چونکہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ پر نازل ہونے والی توراۃ تحریفات کا شکار ہو چکی ہے، نیز قرآن میں بیان کیے جانے والے بنی اسرائیل کے بارے میں بیانات، اس کے برعکس ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے لیے یہ عقیدہ قابل قبول نہیں، عرب، اسرائیل ٹکراؤ کی یہی نظریاتی بنیاد ہے جس کا کوئی سیاسی حل سوائے اس کے نہیں کہ یا تو عرب، اسرائیل کے آگے شکست تسلیم کر کے، دریائے فرات سے لے کر دریائے نیل تک کا علاقہ خالی کر دیں اور یہودی اپنے ’’ارض موعود‘‘ کا مقدس علاقہ حاصل کر لیں جس کو حاصل کرنا ان کا مذہبی فریضہ بھی ہے اور یا پھر عرب، ان سے لڑیں یہاں تک کہ یہود فلسطین چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کر دیے جائیں، اور یہ کام (یعنی جہاد) اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد قائم نہ کریں۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کو یروشلم سے ہندوستان واپسی سے قبل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ سر محمد اقبال نے موتمر اسلامی میں اپنی الوداعی تقریر میں فرمایا:

''میرا ایمان ہے کہ اسلام کا مستقبل اہل عرب کی ذات سے وابستہ ہے اور ان کا مستقبل ان کے باہمی اتحاد پر موقوف ہے۔ ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے کہ عظیم الشان طاقت بن جائیں۔ اسلام کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اس الحاد اور مادیت کا مقابلہ کامیابی سے نہیں کرسکتی جو یورپ سے نشر و اشاعت حاصل کر رہا ہے...... مجھے اسلام کے خارجی دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں، میرے خیال میں اگر کوئی خطرہ ہے تو اندرونی دشمنوں سے ہے۔''(۱۳)

علامہ کے ان الفاظ سے پھر یہی بات سامنے آتی ہے کہ علامہ موصوف صیہونی سازشوں سے اس وقت تک کما حقہ آگاہ نہیں تھے، وہ یہ تو دیکھ رہے تھے کہ امت انتشار کا شکار ہے اور اس کا حل بھی وہ تجویز کرتے ہیں، لیکن امت عدم اتحاد کا شکار کیوں ہے؟ کیا وہ ان اسباب تک پہنچ گئے تھے......؟ یہ اہم سوال ہے۔ میری ناچیز رائے میں اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ غالباً یہ ان کے علم میں نہیں تھا کہ مصطفیٰ کمال کس طرح صیہونیوں کا آلہ کار بن کر خلافت کا خاتمہ کرتا ہے جس کے لیے علامہ رطب اللسان ہوتے ہیں۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ یہودیوں کی چالاکی اور مکاری سے بالکل آگاہ نہیں تھے، ورنہ وہ یہ نہ کہتے۔

جس کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ (بالِ جبریل)

اس سلسلہ کی ایک اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کو متحد کر کے فلسطین میں بسانے کی صیہونی تحریک کا بانی ایک یہودی تھیوڈور ہرتسل (Theodor Hertzel) کو سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کو متحد کر کے ایک ملک میں آباد کرنے کی فکری بنیاد عیسائیوں نے فراہم کی۔ آج اسرائیل کو سب سے زیادہ معاونت فراہم کرنے والے امریکی اور یورپی عیسائی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عیسائی، یہودیوں سے سخت نفرت کرتے (اور کیتھولک عیسائی کرتے بھی ہیں) کیونکہ یہ یہودی ہی تھے جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور انہیں صلیب پر چڑھایا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل بات یہ ہے کہ جب قرن وسطی کے آخری سالوں میں عیسائیوں میں اصلاحات کا دور چلا تو مارٹن لوتھر کی تحریک کے نتیجے میں عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا، یہ فرقہ اللہ اور بندے کے درمیان پادری کے وسیلہ کو نہیں مانتا۔ ان کا ماننا یہ ہے کہ ہر شخص کو کتاب مقدس پڑھنے کا حق حاصل ہے، عیسائیوں کے خیالات میں یہ تبدیلی صلیبی جنگوں کی وجہ سے آئی تھی، جس کے دوران انہوں نے دیکھا کہ مسلمان بغیر جرمنی اور برطانیہ میں تیزی سے پھیلا۔ توراۃ سے براہ راست رجوع کرنے کے نتیجے میں انہیں ''ارض موعود'' (Promised Land) کے بارے میں حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب کے ساتھ کیے جانے والے آسمانی عہد کا علم ہوا، اور وہ اس بات کے قائل ہوئے کہ فلسطین یہودیوں کی سرزمین ہے۔ چنانچہ عرب مسلمانوں کو فلسطینی بلکہ ارض موعود کے تمام علاقوں سے نکال باہر کرنا ان کے مذہبی عقیدے کے مطابق جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری اور لازمی بھی ہے۔ یاد رہے کہ کیتھولک فرقہ کے یہ عقائد نہیں ہیں۔ ان کا کلیسا یعنی رومی کلیسا ہمیشہ یہودیوں اور ان کی دعوت پر لعنت کرتا رہا ہے۔ ان کی کئی تنظیمیں، محض معاشرے کو یہودیوں کے وجود سے پاک کرنے کے لیے بنائی گئیں جس کی سرپرستی پاپائے روم کیا کرتا تھا، اسی بنا پر فرانس، برطانیہ، اسپین اور جرمنی سے یہودی بڑی تعداد میں نکالے گئے، کیونکہ کیتھولک عیسائی، یہودیوں کی بابت یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوقات میں خبیث ترین اور شریر ترین مخلوق یہودی ہیں، ایک طرف یہودیوں کی جلاوطنی کا یہ سلسلہ تیرہویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر پندرہویں صدی تک چلا تو دوسری طرف یہی صدیاں دو بڑے عیسائی فرقوں یعنی یعنی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کے مابین تصادم کی خونریز صدیاں ہیں۔ جس کی وجہ سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے بھی ہجرت کی اور بیشتر نو دریافت شدہ امریکہ میں جا کر آباد ہوئے۔ امریکی معاشرے کی اٹھان پروٹسٹنٹ عقائد پر ہوئی یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ، اسرائیل کا سب سے بڑا حمایتی ہے۔

جس زمانے میں...... خصوصا انیسویں صدی میں...... امریکا اور برطانیہ میں پروٹسٹنٹ تحریک فروغ پا رہی تھی، اس زمانہ میں صیہونی تحریک (Zionist Movement) کی فکری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنیادوں کا آغاز ہوا۔ جس کے کچھ عرصہ کے بعد صیہونی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔ جسے تھیوڈور ہرتشل کی صیہونی تحریک سے امتیاز کرنے کے لیے نصرانی صیہونی تحریک (Christian Zionsm) کا نام دیا گیا۔ مثلاً ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں برطانیہ میں ''دریافت فلسطین'' کے لیے ایک فنڈ قائم کیا گیا جس کا نگران کنٹربری (Canterbury) کے لاٹ پادری کو مقرر کیا گیا۔ وہ برطانیہ کا بشپ اعظم تھا جسے توریت میں مذکورہ ارض موعود اور اس کی حدود کی دریافت کا کام سونپا گیا تھا۔ (۱۴)

امریکا میں بھی تھیوڈور ہرتشل کی صیہونی تحریک سے پہلے بلیک اسٹون (پیدائش ۱۸۴۱ء) نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کا مطالبہ کر دیا تھا۔ بلیک اسٹون کوئی یہودی نہیں بلکہ امریکا کا کٹر عیسائی تھا۔ یہ Jesus is Coming نامی ایک کتاب کا مؤلف ہے جو اپنے وقت کی بیسٹ سیلر تھی، اس کتاب کے لگ بھگ دس لاکھ سے زائد نسخے فروخت ہوئے اور ۴۸ سے زائد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا جس میں ایک ترجمہ عبرانی زبان میں بھی تھا۔ بلیک اسٹون اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''تورات کی رو سے صیہونی مملکت کو بننا ہی ہے۔'' (۱۵)

گویا تھیوڈور ہرتسل (یہودی) کی صیہونی تحریک سے پہلے قیامِ اسرائیل کا مطالبہ کرنے والے عیسائی تھے نہ کہ یہودی۔ اس کی وجہ جیسا کہ پہلے بھی بیان کی گئی یہ تھی کہ دونوں ہی (یعنی یہودی اور عیسائی) ایک ہی کتاب مقدس کے ماننے والے ہیں۔ عیسائیوں کی مذہبی کتاب کل بائبل ہے (جس میں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید دونوں شامل ہیں) لیکن یہودیوں کی مذہبی کتاب صرف عہد نامہ عتیق ہے وہ عہد نامہ جدید کو مانتے ہی نہیں۔ ارض موعود کا ذکر بار بار عہد نامہ عتیق (یعنی توراۃ) میں آیا ہے، کتاب مقدس پڑھنے والا عیسائی اپنی ابتدا عہد نامہ عتیق سے کرتا ہے، لہٰذا ارض موعود کے سلسلے میں اس کا وہی عقیدہ بن جاتا ہے جو ایک یہودی کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جو عیسائی ہیں، خصوصاً پروٹسٹنٹ، وہ یہودیوں سے زیادہ صیہونی ہیں۔ لہٰذا ریاست اسرائیل کی تشکیل اور یہی لوگ محافظت کے علم بردار ہیں۔

صیہونیت کی جدید تحریک کا بانی تھیوڈور ہرتسل کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ ویانا (اسٹریا) کا ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوجوان صحافی تھا، اس کا کتابچہ The Jewish State (Der Judenstaat) ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا جس میں اس نے ایک یہودی ریاست کے قیام کے عملی پہلوؤں کو پیش کیا تھا۔ اس کے اگلے سال اگست ۱۸۹۷ء میں اس نے سویڈن کے شہر بیسل (Basle) میں پہلی صیہونی کانگریس منعقد کی۔ جس نے اس تحریک کو عالمی سیاسی تحریک کی شکل دے دی۔ ہرتسل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے: " At Basle,loundedthe jewish,state,If is aidthisout loudtoday lwould be answerd by universal laugter. If not infivyesrs, certainly in50, every one will Know it- "[16]

اس پہلی کانگریس کے بعد تھیوڈور ہرتسل نے ہر سطح پر یہودی ریاست کے قیام کے لیے سرگرمیاں شروع کر دیں، اس سلسلہ میں وہ عثمانی خلیفہ اور جرمن شہنشاہ ولیم ثانی سے بھی ملا۔ اس نے یہ ملاقاتیں ۱۸۹۸ء میں کیں لیکن عثمانی خلیفہ نے اپنی حیات میں فلسطین کا کوئی قطعہ زمین اسے دینے سے انکار کر دیا۔ تاہم اسے برطانیہ اور امریکا کے مقتدر طبقوں میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ عیسائی صیہونیوں کی کوششیں بھی اس کا کام آسان کر رہی تھیں۔ بلیک اسٹون نے جس کا تذکرہ پہلے بیان کیا گیا، اپنے رفقا کی مدد سے ایک یادداشت مرتب کی اور ۴۱۳ سے زائد اہم امریکی شخصیات سے اس یادداشت کی حمایت میں دستخط لینے میں کامیاب ہوا جن میں منتخب ارکان اسمبلی، جج، وکیل اور دیگر اہم شخصیات شامل تھیں۔ یہ یادداشت امریکی صدر بینجمن کی خدمت میں پیش کی گئی۔ یادداشت میں اسرائیلی مطالبات کو تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی تھی اور یہودیوں کو ارض فلسطین میں بسانے کے لیے امریکی صدر سے اپنا بھرپور تعاون اور اثر ورسوخ استعمال کرنے کی درخواست کی گئی تھی، مذکورہ یادداشت ۱۹۱۹ء میں مرتب کی گئی۔

اس سے بھی دو سال قبل نومبر ۱۹۱۷ء میں اعلان بالفور (Balfour Declaration) ہو چکا تھا جس کا محرک جیمز بالفور تھا، وہ توریت پر پختہ یقین رکھتا تھا۔ اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم جارج لوئیس (George Louis) تھا جس نے اپنے متعلق صراحت سے کہا ہے کہ وہ صیہونی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور توراۃ میں مذکور ''ارضِ مقدس'' پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ (۱۷)

علامہ اقبال جن برسوں میں یورپ میں تھے، ان برسوں میں صیہونی تحریک، جس نے پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور یہودیوں کو یکجا کر رکھا تھا، چل رہی تھی، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ علامہ اقبال اسی وقت اس سے واقف ہوگئے تھے، لیکن یہ ضرور ہے کہ اپنی فکری ارتقا کے آنے والے برسوں میں انہیں اس ''یکجائی'' کا اندازہ ہوگیا تھا، ورنہ وہ فلسطینی عرب سے یہ نہ کہتے:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ　　میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جینوا میں ہے نہ لندن میں　　فرنگ کی رگِ جاں، پنجہ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات　　خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے (ضرب کلیم)

وہ یہود اور انگریزی گٹھ جوڑ کا معاملہ سمجھ گئے تھے، کہتے ہیں۔

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق　　ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا؟
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور　　قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا (ضرب کلیم)

علامہ اقبال جو بیسویں صدی میں صرف ۳۸ برس حیات رہے، تاہم اس دوران عالمی سیاسی منظرنامے پر بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہوتی رہیں، جن پر علامہ اقبال نے نظر رکھی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظم میں اور نثر میں بھی، وہ امت مسلمہ کے حوالے سے عرب دنیا اور فلسطین کے مسئلہ سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ان معاملات پر گہری نظر رکھی، ہندوستانی مسلمان بھی خلافت عثمانیہ سے ذہنی اور دینی ہم آہنگی رکھتے تھے، جنگ عظیم اول کے دوران مقامات مقدسہ کی حفاظت اور ادارہ خلافت کے تحفظ کے لیے تحریک خلافت نے ہندوستانی معاشرے میں خاصی ہلچل مچا رکھی تھی.

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر سلطنت عثمانیہ کے مفتوحہ علاقوں کے بٹوارہ اور ان کی نگرانی کے لیے اتحادیوں کی ایک خود غرض اور مفاد پرست نام نہاد جمعیت اقوام (League of Nation) وجود میں آئی جس کا مورث اعلیٰ خود برطانیہ تھا۔ اس نے جنگ کے ختم ہوتے ہی فلسطین کو اپنی ماتحتی میں لے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر وہاں فوجی حکومت قائم کردی، اب نہ شریف مکہ رہے نہ ان کی آزاد عرب ریاست کا سہانا خواب۔ جس کا وعدہ خود اتحادیوں نے دوران جنگ ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ عربوں سے کیا تھا اور اس یقین دہانی کے جواب میں عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی، جس سے مشرقی محاذوں پر سلطنت عثمانیہ کی شکست کا سامان فراہم کیا تھا۔ بہر حال جنگ کے خاتمے پر دولت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا اور اس کے عرب علاقوں پر مسیحی برطانیہ اور فرانس کا تسلط قائم ہوا، جنہوں نے جمعیت اقوام کے ذریعہ اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کا راستہ تلاش کر لیا۔ (۱۸)

برفتند تا روش رزم دریں بزم کہن — دردمندان جہاں طرح نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند — بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اسی جمعیت اقوام عالم کے آرٹیکل ۲۲ کی رو سے فلسطین کو برطانوی انتداب کا حصہ قرار دیا گیا اور اس کے مستقبل کے فیصلے کو استصواب پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ برطانوی اور یہودی سازش کا حصہ تھا کہ اعلان بالفور، جس کا تذکرہ صفحات گزشتہ میں کیا گیا، اسی انتداب کا حصہ قرار دیا گیا اور آرٹیکل ۲ کی رو سے فلسطینی علاقوں میں یہودی قومی وطن (National Home) کی تشکیل کو برطانوی ذمہ داری قرار دے دیا گیا اور آرٹیکل ۴ کی رو سے فلسطین کے عرب علاقوں میں یہودیوں کی آبادکاری کی اجازت دی گئی۔ آرٹیکل ۶ میں ضمناً عربوں کی تسکین کے لیے اتنا ضرور ذکر کر دیا گیا کہ یہودی قومی وطن سے عربوں کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ (۱۹)۔ اعلان بالفور میں لکھے جانے والے الفاظ کی کرشمہ سازیوں نے خطرناک صیہونی عزائم کی تفہیم کو دشوار بنا دیا اور دنیا، بشمول ہندوستانی دانشور یہی سمجھتے رہے کہ فلسطین میں محض یہودیوں کے ایک قومی وطن کی بات ہو رہی ہے، کسی سیاسی ریاست کی تشکیل کا مرحلہ درپیش نہیں ہے۔

اس کے بعد برطانیہ کی پالیسی اسی پر مرکوز رہی کہ فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کو آسان بنایا جائے اور اس خطے سے اسلامی اثرات کو بتدریج ختم کیا جائے۔ عربوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ان کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے چینی نے آگے چل کر عرب، یہود فسادات کی شکل اختیار کر لی ۔۱۹۲۹ء میں ''دیوار گریہ'' (Wailing Wall) کے سامنے عبادت کرنے پر عرب یہود فساد شروع ہو گیا۔اس فساد پر یہودیوں نے برطانیہ سے شکایت کی، برطانیہ نے فوری طور تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا، جس نے ۱۹۳۰ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں عربوں کو موردالزام قرار دیا گیا۔دوسری طرف برطانیہ کی زیر سرپرستی یہود آبادی کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔دسمبر ۱۹۳۳ء میں تیس ہزار یہودی باہر سے لاکر بسائے گئے ۱۹۳۴ء میں بیالیس ہزار، ۱۹۳۵ء میں اکسٹھ ہزار یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا گیا، اس پر فلسطینی عربوں نے شدید احتجاج کیا، اپریل ۱۹۳۶ء میں الحاج امین الحسینی کی قیادت میں چھ ماہ تک ہڑتال جاری رہی ۔پیل رائل (Peel Royal) کمیشن نے بالاخر برطانیہ پر واضح کر دیا کہ چونکہ عرب اور یہودیوں کو بیک وقت خوش نہیں رکھا جا سکتا، لہذا فلسطین کا واحد حل اس کی تقسیم ہے، اس نے سفارش کی آئندہ پانچ برسوں میں ہر سال بارہ ہزار یہودی باہر سے لاکر یہاں بسائے جائیں، نیز مسلم اکثریت کے علاقوں سے عربوں کا انخلاء کر دیا جائے، عربوں کی صدائے احتجاج کو برطانیہ نے بربریت کے ساتھ کچل دیا۔اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ہائی عرب کمیٹی کو غیر قانونی قرار دے کر قائدین عرب کو جزائر میں جلاوطن کر دیا۔(۲۰)

پیل رائل کمیشن کی تقسیم فلسطین کی تجویز جب علامہ اقبال کے سامنے آئی تو وہ خاصے مضطرب ہوے۔۲۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں:

''یہ رپورٹ مسلمانان ایشیا کے لیے بڑی عبرتوں کا سرمایہ ہے۔تجربے نے اس کو بہ تکرار واضح کر دیا ہے کہ مشرق قریب کے اسلامی ممالک کی سیاسی وحدت واستحکام عربوں اور ترکوں کے فوری اتحاد مکرر پر موقوف ہے...... مسئلہ فلسطین کے امکانات، ممکن ہے مسلمانوں کو اس متحدہ انگریزی، فرانسیسی ادارہ جسے جمعیۃ الاقوام کا پرشکوہ لقب دیا گیا ہے، کی رکنیت کی حیثیت پر غور کرنے پر مجبور کریں اور ایک ایشیائی جمعیۃ الاقوام کے قیام وترتیب پر مجبور ہوں...... موجودہ زمانہ ایشیا کی غیر عربی اسلامی سلطنتوں کے لیے بھی ایک ابتلا وآزمائش کا دور ہے کیونکہ تنسیخ خلافت کے بعد مذہبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سیاسی نوعیت کا یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ (فلسطین) ہے جو تاریخی قوتیں ان کے سامنے لا رہی ہیں۔ (۲۱)

علامہ اقبال کا یہ بصیرت افروز تبصرہ اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ بالآخر اسلامی ممالک کی تنظیم (O-I-C) کی بنیاد، اسی مسئلہ فلسطین کی وجہ سے پڑی، جب بیت المقدس کو آگ لگانے کا معاملہ سامنے آیا۔

تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر دانشور کی طرح علامہ اقبال کی فکر نے ارتقائی مدارج طے کیے۔ سفر یورپ سے قبل وہ ہمیں ایک ایسے ہندوستانی شاعر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ جو برطانیہ کی غلامی میں پلنے والی ہندوستانی قوم کے دکھوں کا مداوا کرنے کی تڑپ کا حامل ہے۔ انقلاب آفریں بیسویں صدی کے اوائل میں وہ یورپ کا سفر کرتے ہیں۔ جہاں انہیں صرف اسی بات کا موقع نہیں ملا کہ وہ اقوام مغرب کے سیاسی افکار سے آگاہی حاصل کریں بلکہ انہوں نے مختلف مغربی نظاموں کا بھی تجربہ حاصل کیا۔ مغربی جمہوریت، بادشاہت، استعماریت، لادینیت، اور قومیت کا صرف دور سے بیٹھ کر مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کے عملی تجربے میں شامل رہے اور ان کے نتائج سے آگاہی حاصل کرتے رہے اور مختلف نشستوں میں اپنے مکالمات اور تقاریر کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے رہے، بدقسمتی سے ان تقاریر یا مکالمات کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ہے (۲۱)، لہذا پورے دعویٰ سے یہ کہنا کہ وہ اس زمانے میں چلنے والی صیہونی تحریک، جو صرف یہودیوں کی ہی نہیں بلکہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی بھی تحریک تھی، سے واقف نہیں تھے۔ ایک مشکل معاملہ ہے۔ یہ وہ سال ہیں جب مغرب ان بحثوں کی زد میں تھا اور اقبال جن کا واسطہ عموماً علمی حلقوں سے پڑتا تھا، ان بحثوں سے لاتعلق نہیں رہے ہوں گے، یہ دوسری بات ہے کہ براہ راست صیہونی تحریک پر جو آگے چل کر مسئلہ فلسطین کی بنیاد بنی، انہوں نے اظہار خیال نہیں کیا، تاہم یورپ سے واپسی پر جب انہوں نے مسلم امہ کے مسائل پر لکھنا شروع کیا تو مسئلہ فلسطین بھی زیر بحث آیا، اس میں شدت اس وقت آئی جب دوسری گول میز کانفرنس کے بعد وہ خود بنفس نفیس یروشلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے، اور فلسطینیوں کے مسائل کا خود مشاہدہ کیا ان کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کی ضرورت پر زور دیا اور سیاسی طور پر اس مسئلہ کے حل کے کی تجاویز دیں۔ اور انتقال سے قبل گویا وضاحتاً انہوں نے مسئلہ فلسطین کو ایک سیاسی ہی نہیں مذہبی مسئلہ قرار دیا جس کا ان حل ان کے خیال میں مسلمانوں یا ایشیائی ممالک کی جمعیۃ الاقوام کا قیام ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

حواشی

(۱) Zionism,Definition and Early historybymideast Web for CoexistenciMiddle EResources,http\ www, mideastwed,org.

(۲) اگر ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق پر اعتبار کرتے ہوئے علامہ اقبال کا سنہ ولادت ۱۸۷۳ء مانا جائے تو علامہ کی عمر یہی بنتی ہے۔ (علامہ اقبال، حیات فکر وفن مرتب: ڈاکٹر سلیم اختر، مقالہ علامہ اقبال کی پیدائش از ڈاکٹر وحید قریشی، ص ۲۷، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء)

(۳) طرابلس بیسویں صدی کے آغاز تک سلطنت عثمانیہ کا صوبہ تھا، ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی پچاس ہزار کی فوج کے ساتھ عثانی سلطنت کے اس دور دراز علاقے پر حملہ آور ہوا، جہاں تک ترک افواج کا پہنچنا اس لیے دشوار تھا کہ درمیان میں مصر کا علاقہ پڑتا تھا۔ جہاں برطانیہ کی عمل داری قائم ہو چکی تھی۔ لہٰذا ترک بھیس بدلکر کسی نہ کسی طرح اٹلی پہنچے جس میں سرفہرست انور پاشا، مصطفیٰ کمال پاشا اور عصمت انونو تھے، انور پاشا نے اپنی حیرت انگیز قابلیت سے پورے ملک کو فوجی کیمپ بنا دیا۔ یہی وہ دور ہے جس میں ترکوں کے جذبہ جہاد کا دنیائے اسلام میں غلغلہ ہوا اور ہندوستانی مسلمانوں میں بھی بیداری کی لہر آئی (ظہیر، نگار سجاد، جدید ترکی، ص ۲۴، قرطاس، کراچی، ۲۰۰۱ء)

(۴) اپنی ایک نظم "طلوع اسلام" میں وہ حجاز کے گورنر، شریف مکہ کی ترکوں کے ساتھ غداری کو اس طرح رقم کرتے ہیں:

حرم رسوا ہوا، پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانان تاری کس قدر صاحب نظر نکلے

تفصیلات کے لیے دیکھئے جدید ترکی، از ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، باب چہارم، "الغائے خلافت، ص ۷۹ تا ۸۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۵) ۷، جنوری ۱۹۲۹ء کو انجمن اسلام، مدراس نے علامہ اقبال کو ایک سپاس نامہ پیش کیا تھا، جس کے جواب میں علامہ اقبال نے جو تقریر کی، یہ جملے اس میں کہے گئے۔ دیکھیے ''گفتار اقبال'' مرتب: محمد رفیق افضل، ص ۸۲، طبع سوم ۱۹۸۶ء، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور

(۶) جدید ترکی، ص ۱۰۲، ۱۰۳

(۷) ''اعلان بالفور'' کو عالم اسلام میں ''رسوائے عالم'' اعلان کہا گیا ہے۔ یہ اعلان ایک خط میں کیا گیا تھا جس کے لیے انگلستان کی مجلس وزرا نے ارل جیمز بالفور کو اختیار دیا تھا کہ وہ برطانوی یہودیوں کے لیڈر لارڈ سچائلڈ کو خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔ یہ خط ۲، نومبر ۱۹۱۷ء کو دفتر خارجہ سے لکھا گیا جس کا یہ ہے:

''ملک معظم کی گورنمنٹ کی جانب سے آپ کی خدمت میں یہ پیغام پہنچانے میں مجھے بے حد خوشی ہے جو صیہونی یہودی دیرینہ تمنا کے پورا کرنے کے لیے ہمدردانہ اعلان ہے، اس کی تصدیق کابینہ نے بھی کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ: ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن قائم کرنے کی تجویز کے حق میں ہے اور وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کرے گی لیکن یہ واضح رہے کہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جائے گا جس سے فلسطین میں رہنے والی غیر یہودی قوموں یا دوسروں ممالک میں بسنے والے یہودیوں کے شہری یا مذہبی حقوق پر کسی قسم کا برا اثر پڑے۔ آپ کا مخلص...... آرتھر جیمز بالفور''۔

اس اعلان کو صدر ونس (مشہور چودہ نکات) اور فرانس واٹلی کی حکومتوں کی منظوری حاصل تھی بعد میں جب ۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء میں انجمن اقوام (League of Nations) نے حکومت برطانیہ کو فلسطین پر قبضہ (mandate) کا اختیار دیا تو یہ خط انتداب (mandate) کی عبارت میں شامل کیا گیا، گویا دنیا کو یہ پیغام دیا گیا کہ اعلان بالفور کو سرکاری اور بین الاقوامی طور پر قبول کر لیا گیا ہے اور اگر حکومت برطانیہ اس سلسلہ میں کامیاب نہ ہو سکے تو پھر دنیا کی عیسائی حکومتیں اس کام میں مدد دیں۔ یہ خط معاہدے سیورے میں بھی شامل کیا گیا تھا (منشی عبدالقدیر، ''بیت المقدس''، ص ۱۸۲۔۱۸۳، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی)۔

(۸) گفتار اقبال، ص ۲۳۴۔

(۹) ایضاً ص ۱۴۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۰) بنی اسرائیل کی تاریخ حضرت یعقوب سے شروع ہوتی ہے، جو حضرت اسحاق کے بیٹے حضرت ابراہیم کے پوتے تھے۔ حضرت یعقوب کا لقب ''اسرائیل'' تھا جس کے معنی ہیں عبداللہ کا بندہ۔ چنانچہ تاریخ میں حضرت یعقوب کی اولاد ''بنی اسرائیل'' کہلائی۔ حضرت یعقوب کی چار بیویوں سے بارہ بیٹے تھے، انہی سے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کا ظہور ہوا۔ ان بارہ قبائل کا تشخص صدیوں تک قائم رہا۔ حضرت موسیٰ جو حضرت یعقوب کے......سال بعد مبعوث ہوئے، ان کے زمانے میں بھی بنی اسرائیل انہی بارہ قبائل میں منقسم تھے، لہٰذا ضرب کلیم سے صحرائے سینا میں ان سب کے لیے بارہ چشمے جاری ہوئے۔ جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ حضرت موسیٰ نے ان میں تبلیغ وہدایت کے لیے بارہ نقیب مقرر کیے۔ ان میں یہ نسلی اختلاف مابعد کے زمانوں میں بھی قائم رہا۔ حضرت یعقوب کا چوتھا بیٹا یہودا (Juda) تھا جس کے خاندان نے آگے چل کر سلطنت اور طاقت حاصل کی، لہٰذا کل بنی اسرائیل بالعموم یہودی کہلانے لگے اور آج تک یہی صورت حال ہے۔

(۱۱) کنعانی سے مراد عرب ہیں۔

(۱۲) گفتار اقبال، ص۱۴۴۔

(۱۳) الحوالی، شیخ سفر عبدالرحمٰن، فلسطین، سچے اور جھوٹے وعدے کی کشمکش، ص ۲۵۔

(۱۴) ایضاً۔

(۱۵) www.mideast.web.org Zionisim and the crcation of Isreal,:pg4of17,

(۱۶) فلسطین، سچے اور جھوٹے وعدہ کی کشمکش، الحوالی، شیخ سفر عبدالرحمٰن، ص ۲۵۔

(۱۷) ندوی، سید حبیب الحق، فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات، ص۳۷۹، کراچی، ۱۹۷۶ء۔

(۱۸) ایضاً، ص۳۷۹۔

(۱۹) ایضاً، ص۳۸۰۔

(۲۰) ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ترکی میں احیاء اسلام اور اقبال، (مقالہ در علامہ اقبال، حیات فکر وفن، مرتب: ڈاکٹر سلیم اختر، ص۸۵۲، لاہور، ۲۰۰۳ء)۔

(۲۱) مستنصر میر، اقبال، ص۱۳۲، آکسفورڈ، کراچی ۲۰۰۶ء۔

© rasailojaraid.com